20

خدا تعالیٰ رمضان المبارک میں مومنوں کی دعائیں زیادہ سنتا ہے

(فرمودہ 8 جولائی 1949ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''پچھلے جمعہ میں مَیں نے دوستوں کو توجہ دلائی تھی کہ انہیں رمضان کے مہینہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہیے اور جن کو خدا تعالیٰ توفیق دے انہیں روزے رکھنے چاہییں روزے چھوڑنے نہیں چاہییں۔ رمضان کے مہینہ کی خصوصیتوں میں سے ایک اہم خصوصیت خدا تعالیٰ نے قبولیتِ دعا بیان فرمائی ہے۔ جو لوگ دعاؤں کے قائل ہیں وہ تو دعا کرتے ہی رہتے ہیں لیکن ایسے لوگ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو رسمی اور نسلی ایمان کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آتے ہیں کہ دعائیں کرنی چاہییں یا ان کے ماں باپ دعائیں کیا کرتے تھے اس لیے وہ بھی دیکھا دیکھی دعائیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسی دعا کی حیثیت کھجلی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جس طرح خارش ہوتی ہے اور انسان کھجلانے لگ جاتا ہے اس کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہوتا یونہی ایک اندرونی مجبوری پیدا ہو جاتی ہے اور اسے خواہش محسوس

ہوتی ہے جس کی وجہ سے اسے کھجلانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اِسی طرح رسمی اور نسلی ایمان والوں کا حال ہوتا ہے۔ چونکہ انہوں نے اپنے ماں باپ اور دوسرے بزرگوں کو دعائیں کرتے دیکھا ہوتا ہے اس لیے وہ بھی دیکھا دیکھی دعا کرنے لگ جاتے ہیں۔ نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ دعا کیا ہے اور نہ ہی انہیں قبولیتِ دعا پر یقین ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا شخص قبولیتِ دعا پر یقین بھی رکھتا ہے تو اس کا ایمان محض جہلاء کا سا ہوتا ہے۔ اُس پر ذرا سی جرح یا اعتراض بھی کیا جائے تو وہ فوراً کہہ دیتا ہے کہ یہ میری غلطی تھی۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو سمجھ بوجھ کر دعا کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ خداتعالیٰ دعاؤں کو قبول کیا کرتا ہے لیکن انہیں یہ علم نہیں ہوتا کہ دعا چند شرائط کے ساتھ قبول ہوتی ہے۔ نہ ہر دعا قبول ہوتی ہے اور نہ ہر امر کے لیے دعا قبول ہوتی ہے۔ دعا صرف انہی امور کے متعلق قبول ہوتی ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے پہلے سے بیان فرما دیا ہے کہ وہ دعا کی حد میں آتے ہیں اور جو امور دعا کی حد سے باہر ہوتے ہیں ان کے متعلق دعا کرنے سے کچھ اثر نہیں ہوتا۔ دعا کے متعلق ایک پنجابی بزرگ نے کہا ہے کہ "جو منگے سو مر رہے مرے سو منگن جائے"۔ یعنی دعا کرنا موت کے برابر ہے۔ جب تک کوئی انسان دعا میں موت قبول نہیں کرتا اُس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگوں کی دعا ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ہم بچپن میں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ ایک لڑکے کی آنکھیں کپڑے سے باندھ دی جاتی تھیں اور جب وہ دوسروں کی تلاش میں جاتا تھا تو جو اسے ہاتھ لگا دیتا تھا یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بچ گیا ہے یا اَور زیادہ چھوٹی عمر کے بچے بجائے ہاتھ لگانے کے اُس پر تھوکا کرتے تھے۔ اِسی طرح بہت سے دعا کرنے والے خداتعالیٰ کی درگاہ میں تھوک کر آجاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ان کی دعا قبول ہوگئی۔

حالانکہ قبولیتِ دعا کے لیے ضروری ہے کہ دعا کرنے والے کو قبولیتِ دعا پر یقین ہو اور وہ یہ ایمان رکھتا ہو کہ خداتعالیٰ اس کی دعا سنے گا اور پھر وہ انہی امور کے متعلق دعا کرے جو خداتعالیٰ نے پہلے سے بیان فرما دیئے ہیں کہ ان کے متعلق دعا سُنی جائے گی۔ دوسرے دعا اس طریق پر کی جائے جو خداتعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ تیسرے دعا کرنے والے کو صرف قبولیتِ دعا پر ہی یقین نہ ہو بلکہ فیضانِ الٰہی پر اِتنا یقین ہو کہ وہ سمجھتا ہو کہ خداتعالیٰ اسے کبھی بھی خالی ہاتھ واپس نہیں کرے

گا۔ بیشک ایک شخص کو یہ یقین تو ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعائیں سُنا کرتا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعائیں سنا کرتا تھا یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعائیں سنا کرتا تھا یا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعائیں سنا کرتا تھا مگر اِتنا یقین اسے قبولیتِ دعا کا حقدار نہیں بنا دیتا۔ قبولیتِ دعا کا حقدار وہ اُسی وقت ہوگا جب اسے اپنے متعلق بھی یقین ہو کہ خدا تعالیٰ اس کی دعاؤں کو سنے گا۔ اور یہ یقین تبھی پیدا ہوسکتا ہے جب اس کا خدا تعالیٰ سے صرف دماغی تعلق نہ ہو بلکہ محبت کا تعلق ہو اور وہ محسوس کرتا ہو کہ وہ خدا تعالیٰ سے پیار رکھتا ہے۔ جب وہ یہ محسوس کرے گا کہ وہ خدا تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا تعالیٰ اس سے محبت نہ کرے۔ دماغی طور پر محبت کا تعلق تو اپنے افسر سے بھی ہوسکتا ہے، اپنے محکمہ سے بھی ہوسکتا ہے، اپنی گورنمنٹ سے بھی ہوسکتا ہے، اپنے محلّہ والوں سے بھی ہوسکتا ہے لیکن ان کے ذکر پر انسان کے اندر فدائیت پیدا نہیں ہوتی، اس کے اندر ان سے ملنے کی رغبت پیدا نہیں ہوتی، اس کے قلب میں رِقّت پیدا نہیں ہوتی لیکن وہی شخص جب اپنی بیوی کا خیال کرتا ہے یا اپنی بہن کا خیال کرتا ہے تو اس کے جذبات ویسے نہیں ہوتے جیسا کہ بازار والوں یا محلّہ والوں کا خیال کرنے پر ہوتے ہیں۔ مثلاً جب وہ سوچتا ہے کہ فلاں دکان پر مٹھائی اچھی ہوتی ہے یا فلاں دکان پر میوے اچھے ہوتے ہیں تو اس کے اندر وہ جذبات پیدا نہیں ہوتے جو اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب اُسے کوئی شخص یہ پیغام دیتا ہے کہ رستہ میں اسے اس کی ماں ملی تھی اور وہ اسے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتی تھی یا اس کی بیٹی آئی تھی اور کہتی تھی میرے ابّا جان کو میرا سلام کہہ دینا۔ وہ جذبات اَور ہوتے ہیں اور یہ جذبات اَور ہوتے ہیں۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ حلوائی کا خیال کر کے نہ اُسے رونا آتا ہے اور نہ اُسے ہنسی آتی ہے لیکن ماں یا بیٹی یا بیوی کا خیال آنے پر اُس کے اندر صرف محبت کے جذبات ہی پیدا نہیں ہوتے بلکہ بعض دفعہ رِقّت کی وجہ سے وہ بول بھی نہیں سکتا۔ مثلاً اگر وہ یہ خبر سُنے کہ اُس کی ماں یا بیٹی یا بیوی موت کے قریب ہے اور وہ اسے سلام کہتی ہے تو وہ رِقّت کی وجہ سے رو پڑے گا۔

پس دعا کرنے والے کے اندر خدا تعالیٰ کے متعلق جب محبت کے جذبات پیدا ہوں تبھی وہ اس کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔ اور اگر اس کے اندر محبت کے جذبات پیدا نہیں ہوتے تو وہ یہ یقین بھی نہیں کرسکتا کہ خدا تعالیٰ اس کی دعاؤں کو سنے گا اور اس کی مدد کو پہنچے گا۔ بچوں کو دیکھ لو انہیں

بہتیرا کہو کہ میں تمہاری ماں سے تمہیں پٹواؤں گا تو وہ یہی کہتے چلے جائیں گے کہ وہ ہمیں نہیں مارے گی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی یہی وجہ ہے کہ بچہ اپنی ماں کے متعلق محبت کے جذبات رکھتا ہے خواہ وہ مار کے قابل ہی ہو تب بھی وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اسے نہیں مارے گی۔ اسی طرح اگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے اُتنی محبت ہو جاتی ہے کہ تم یقین رکھتے ہو کہ اگر تم سزا کے بھی قابل ہو تو وہ تمہیں سزا نہیں دے گا بلکہ تم سے پیار کرے گا تو یہی وہ مقام ہے جہاں سے قبولیتِ دعا شروع ہوتی ہے۔

خدا تعالیٰ نے رمضان کے متعلق وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس مہینہ میں مومنوں کی دعائیں زیادہ سُنتا ہے مگر وہ سُنتا انہی شرطوں کے ساتھ ہے جو اس نے پہلے سے بیان فرما دی ہیں۔ یعنی انسان کو قبولیتِ دعا اور خدا تعالیٰ کی قدرتوں پر یقین ہو اور دعا انہی امور کے متعلق کی جائے جو دعا کی حد میں آتے ہیں اور دعا اتنی کی جائے جتنی شرائط کے مطابق ہو۔ پھر ساتھ ہی دعا کرنے والے کو خدا تعالیٰ سے محبت ہو اور وہ یہ یقین رکھتا ہو کہ خدا تعالیٰ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی خدا نہیں تھا بلکہ میرا بھی خدا ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کے ماتحت حضرت احمد صاحب سرہندیؒ نے یہ کہہ دیا تھا ؎

پنجہ در پنجۂ خدا دارم من چہ پروائے مصطفٰی دارم

اس سے آپ کی یہی مراد تھی کہ خدا تعالیٰ سے میرا ذاتی تعلق ہے اور وہ براہِ راست مجھ سے پیار کرتا ہے۔ جیسے ایک عورت خاوند سے بھی محبت کرتی ہے اور اپنے بیٹے سے بھی محبت کرتی ہے۔ مگر ماں کی محبت میں بیٹا باپ کا محتاج نہیں ہوتا اُسے اپنی ماں سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ اور ماں بھی اپنے خاوند کا خیال کیے بغیر اس سے محبت کرتی ہے۔ گویا جب وہ خاوند کا خیال کرے گی اس سے بھی محبت کرے گی اور جب بیٹے کا خیال کرے گی اس سے بھی محبت کرے گی۔

اولیاء اللہ نے لکھا ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب مُرید اپنے پیر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ مُراد نہیں کہ تابع اپنے متبوع سے آزاد ہو جاتا ہے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان محبت کرتے کرتے ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اُس کا خدا تعالیٰ سے براہِ راست تعلق ہو جاتا ہے۔ وہ

ہوتا اپنے پیر اور متبوع کے ماتحت ہی ہے اور وہ ان کا فرمانبردار ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ ان کی نافرمانی کرے گا تو خدا تعالیٰ اسے اپنی درگاہ سے باہر نکال دے گا لیکن خدا تعالیٰ اس سے بھی براہِ راست محبت کے تعلقات رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جو قبولیتِ دعا کو یقینی بنا دیتا ہے۔

ہماری جماعت نے خدا تعالیٰ کے جو نشانات دیکھے ہیں اور جو سامان قبولیتِ دعا کے اسے میسر ہیں وہ دوسروں کو نصیب نہیں۔ ایک احمدی جس نے سلسلہ کے لٹریچر کا معمولی مطالعہ بھی کیا ہو وہ قبولیتِ دعا کے متعلق وہ کچھ جانتا ہے جو دوسرے مسلمانوں میں سے ایک بڑا صوفی بھی نہیں جانتا۔

پس خدا تعالیٰ نے ہمیں سامان بہم پہنچا دیئے ہیں مگر ان سے فائدہ اُٹھانا ہر شخص کا اپنا کام ہے۔ دوستوں کو چاہیے کہ وہ رمضان کی برکات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں، احمدیت کی ترقی کے لیے دعائیں کریں، اپنے روحانی درجات کی بلندی کے لیے دعائیں کریں، سلسلہ کا کام کرنے والوں کے لیے دعائیں کریں کہ خدا تعالیٰ ان کے اندر نیکی اور تقویٰ پیدا کرے اور جو غفلت اور سُستی ان کے اندر پائی جاتی ہے وہ دُور کرے۔ پھر ہمیں یہ بھی دعائیں کرنی چاہییں کہ خدا تعالیٰ لوگوں کے دلوں کو کھولے اور وہ احمدیت کو قبول کریں۔ غرض ہمیں ان تمام امور کے لیے دعائیں کرنی چاہییں جن کے ساتھ ہماری جماعت کی ترقی وابستہ ہے تا کہ جب یہ دن گزر جائیں تو ہمارا مقام پہلے سے زیادہ بلند ہو''۔ (الفضل 11/اپریل 1957ء)